ادھر جس دن رما نے گنگوئی دکان سے زیور خریدے اسی دن دوسرے صرافوں کو بھی اس کی قدر دانی کی خبر ملی۔ رما جب ادھر سے نکلتا تو دونوں طرف کے دوکاندار اُٹھ اُٹھ کر سلام کرتے۔ آیئے بابوجی۔ پان تو کھاتے جایئے۔ دو ایک چیزیں ہماری دکان سے بھی تو دیکھیئے۔ رما کا خرم و احتیاط اس کی ساکھ کو اور بڑھاتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک دن ایک دلال رما کے گھر آپہنچا۔ اور اس کے نہیں نہیں کرنے پر بھی اپنا صندوقچہ کھول کر اس کے سامنے رکھ ہی دیا۔

رما نے اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے کہا۔ بھائی اس وقت مجھے کچھ نہیں لینا ہے کیوں اپنا اور میرا وقت برباد کروگے۔

دلال نے بڑی خوشامد سے کہا۔ بابوجی دیکھ تو لیجئے پسند آئے تو لیجئے گا۔ دیکھ لینے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ آخر رئیسوں کے پاس نہ جائیں تو کس کے پاس جائیں اوروں نے آپ سے گہری رقمیں ماریں۔ ہمارے بھاگ میں بدا ہوگا تو ہمیں بھی آپ سے چار پیسے مل جائیں گے۔ بہوجی اور مائی جی کو دکھا لیجئے۔ میرا دل تو گواہی دیتا ہے کہ آپ کے ہاتھوں بہنی ہوگی۔

رما۔ عورتوں کی پسند کو نہ کہو۔ چیزیں اچھی ہونگی ہی۔ پسند آتے کیا دیر لگتی ہے لیکن بھائی اس وقت ہاتھ خالی ہے۔

دلال ہنس کر بولا۔ بابوجی بس ایسی بات کہہ دیتے ہیں کہ واہ! آپ کا حکم ہو جائے تو ہزار پانچسو آپ کے اُوپر نچھاور کر دیں، ہم لوگ آپ کا مزاج دیکھتے ہیں بابوجی! بھگوان نے چاہا تو آج میں سودا کر کے اٹھوں گا۔ دلال نے صندوقچی سے دو چیزیں نکالیں۔ ایک تو نئے فیشن کا جڑاؤ کا کنگن تھا اور دوسرا کانوں کا رنگ دونوں ہی چیزیں بے مثل تھیں۔ ایسی آب تھی گویا چراغ جل رہا ہے۔ دس بج چکے تھے۔ منشی دیا ناتھ دفتر جا چکے تھے۔ رما نے کھانا کھانے جا رہا تھا۔ لیکن ان دونوں

چیزوں کو دیکھ کر اس پر خود فراموشی کی حالت طاری ہوگئی۔ دونوں کیس لئے ہوئے گھر میں آیا۔ اس کے ہاتھ میں کیس دیکھتے ہی دونوں عورتیں ٹوٹ پڑیں اور ان چیزوں کو نکال نکال کر دیکھنے لگیں۔ ان کی چمک دمک نے انہیں ایسا فریفتہ کر لیا کہ ان میں عیب و حسن کا امتیاز ہی نہ رہا۔

جاگیشری۔ آجکل کی چیزوں کے سامنے تو پرانی چیزیں کچھ جچتی ہی نہیں۔

جالپا۔ نہ جانے وہ عورتیں کیسے ان چیزوں کو پہنتی تھیں۔

رما نے مسکرا کر کہا۔ تو دونوں چیزیں پسند ہیں نہ

جالپا۔ پسند کیوں نہیں ہیں۔ اماں جی تم لے لو۔

جاگیشری نے اپنے درد دل کو چھپانے کے لئے سر جھکا لیا۔ جس کی ساری عمر خانگی تفکرات میں کٹ گئی وہ کیا آج خواب میں بھی ان زیوروں کے پہننے کی امید کر سکتی تھی۔

آہ! اس دکھیا کی زندگی کی کوئی بھی مراد تو پوری نہ ہوئی۔ شوہر کی آمدنی کبھی اتنی نہ ہوئی کہ بال بچوں کی پرورش کے بعد کچھ پس انداز ہوتا۔ جب سے گھر کی مالکن ہوئی تب ہی سے گویا اس کی ریاضت شروع ہوئی۔ اور ساری آرزوئیں ایک ایک کر کے خاک میں مل گئیں۔ اس نے ان زیوروں کی طرف سے آنکھیں ہٹا لیں۔ ان میں اتنی کشش تھی کہ ان کی طرف تاکتے ہوئے وہ ڈرتی تھی۔ کہیں اس کی بے نیازی کا پردہ نہ کھل جائے۔ بولی۔ میں لے کر کیا کروں گی بیٹی؟ میرے پہننے اوڑھنے کے دن تو نکل گئے! کون لایا ہے بٹیا؟ کیا دام مانگتا ہے۔

رما۔ ایک مراف دکھا نے لایا ہے۔ ابھی میں نے دام وام نہیں پوچھے۔ مگر دام اونچے ہونگے۔ لینا تو تھا نہیں پوچھ کر کیا کرتا۔

جالپا۔ لینا نہیں تو یہاں لا کے کیوں؟

جالپا نے یہ الفاظ کچھ اس تحکم آمیز لہجہ میں کہے کہ رما کھسیا گیا۔ ان میں کچھ ایسی تحریک، کچھ ایسی ملامت، کچھ ایسا اشتیاق تھا کہ وہ ان چیزوں کو واپس نہ لے سکا بولا۔ تو لے لوں۔

جالپا۔ اماں لینے کو ہی نہیں کہتیں تو لے کر کیا کرو گے؟ کیا مفت میں دے رہا ہے

رما۔ سمجھ لو مفت ہی ملتے ہیں۔

جالپا۔ سنتی ہو اماں ان کی باتیں۔ آپ جا کر لوٹا آئیے۔ جب ہاتھ میں روپے آجائیں گے تو بہت گہنے ملیں گے۔

جاگیشری نے پرہوس انداز سے کہا۔ روپے ابھی تو نہیں مانگتا۔

جالپا۔ ادھار بھی دے گا۔ تو سود لگا ہی لے گا۔

رما۔ تو لوٹا دوں؟ ایک بات چٹ پٹ طے کر ڈالو۔ لینا ہو لے لو۔ نہ لینا ہو لوٹا دو۔ بس دبیش میں نہ پڑو۔

جالپا کو یہ بے لاگ گفتگو اس وقت بہت ناگوار معلوم ہوئی انکار کرنا اس کا کام تھا۔ رما کو تو لینے کے لئے اصرار کرنا چاہیئے تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ رما کے دل میں ذرا بھی احساس ذرا بھی درد نہیں ہے۔ جاگیشری کی طرف ہوسناک نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔ لوٹا دو۔ رات دن کے تقاضے کون لیگا؟

وہ کیسوں کو بند کرنے ہی والی تھی کہ جاگیشری نے کنگن اٹھا کر پہن لیا۔ گویا چھن بھر پہن لینے ہی سے اس کی ہوس پوری ہو جائے گی۔ پھر دل میں اس اوچھے پن پر شرمندہ ہو کر وہ اسے اتارنا ہی چاہتی تھی کہ رما نے کہا۔ اب تم نے پہن لیا ہے۔ اماں تو پہنے رہو۔ میں اسے تمہاری نذر کرتا ہوں۔

جاگیشری کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ جو آرزو آج تک نہ پوری ہوئی بیٹے کی سعادت مندی کی بدولت پوری ہو رہی تھی۔ لیکن کیا وہ اپنے عزیز بیٹے پر قرض کا اتنا

بوجھ رکھ دے گی۔ ابھی اس غریب کی حیثیت ہی کیا ہے۔ نہ جانے روپے جلد ہاتھ آئیں یا دیر میں۔ قیمت بھی تو نہیں معلوم۔ اگر دام اونچے ہوئے تو دے گا کہاں سے؟ اسے کتنے تقاضے سہنے پڑیں گے اور کتنا شرمندہ ہونا پڑے گا۔ پست ہمت ہو کر بولی۔ نہیں بٹیا میں نے یونہی پہن لیا تھا۔ لے جاؤ لوٹا دو۔

ماں کا اداس چہرہ دیکھ کر رما کا دل ہل اُٹھا۔ کیا قرض کے خوف سے وہ اپنی بے نفس ماں کی اتنی خدمت بھی نہ کر سکے۔ ماں کی جانب اس کا کچھ فرض بھی تو ہے۔ بولا روپے بہت مل جائیں گے۔ اماں تم اس کی فکر مت کرو۔

جاگیشری نے بہو کی طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہی تھی کہ لڑکا مجھ پر کتنا ظلم کر رہا ہے۔

جالپا بے غرضانہ انداز سے بیٹھی ہوئی تھی۔ شاید اسے خوف ہو رہا تھا کہ رما یہ کنگن نہ لے لیں۔ اس کے بشرے سے جاگیشری کو معلوم ہو گیا۔ اسے میرا کنگن پہننا ناگوار گذرا اس نے فوراً کنگن اُتار ڈالا۔ اور جالپا کی طرف بڑھ کر بولی۔ میں اپنی طرف سے تمہیں دیتی ہوں۔ بہو مجھے جو کچھ پہننا اوڑھنا تھا پہن اوڑھ چکی۔ اب تم پہنو۔ دیکھوں۔

جالپا کو اس میں مطلق شبہ نہ تھا کہ اماں کے پاس روپے موجود ہیں۔ وہ سمجھی شاید آج دیوی پسیج گئی ہیں۔ ایک لمحہ پہلے اس نے سمجھا تھا کہ روپے رما کو دینے پڑیں گے اس لئے خواہش رہنے پر بھی وہ اسے واپس کر دینا چاہتی تھی۔ جب اماں دام دینے کو تیار تھیں تو انکار کرنے کی کیا ضرورت؟ اوپرے دل سے بولی۔ روپے نہ ہوں تو رہنے دیجئے ابھی کون جلدی ہے؟

رما نے کچھ چڑھ کر کہا۔ تو تم یہ کنگن لے رہی ہو۔

جالپا۔ اماں نہیں مانتیں تو ہم کیا کریں۔

رما۔ تو ان رنگوں کو بھی کیوں نہیں رکھ لیتیں۔

جالپا۔ جا کر دام تو پوچھ آؤ۔

رما۔ تم ان چیزوں کو لے جاؤ۔

رما نے باہر آکر دلال سے دام پوچھے تو سناٹے میں آگیا۔ کنگن سات سو کے تھے اور رنگ ڈیڑھ سو کے۔ اس کا اندازہ تھا کہ کنگن زیادہ سے زیادہ تین سو کے ہونگے اور رنگ چالیس پچاس کے۔ پچھتایا کہ ان چیزوں کے دام پہلے ہی کیوں نہ پوچھ لئے۔ نہیں تو اندر جانے کی نوبت ہی کیوں آتی۔ مگر کچھ بھی ہو۔ واپس تو کرنا ہی پڑے گا۔ اتنا بڑا بوجھ وہ سر پر نہیں لے سکتا۔ دلال سے بولا۔ بڑے مہنگے ہیں بھائی۔ میرا اندازہ تو تین چار سو کے اندر ہی تھا۔

دلال کا نام چرنداس تھا بولا۔ دام میں ایک کوڑی کا فرق پڑ جائے سرکار تو منہ دکھاؤں۔ لالہ دھنی رام کی کوٹھی کا تو مال ہے۔ آپ چل کر پوچھ لیں۔ چھ دام روپے کی دلالی البتہ میری ہے۔ آپ کی مرضی ہے دیجئے یا نہ دیجئے۔

رما۔ تو بھئی ان داموں کی چیزیں تو اسوقت ہم نہیں لے سکتے۔

چرنداس۔ ایسی بات نہ کہیئے بابوجی۔ آپ کے لئے اتنے روپے کون بڑی بات ہے آپ سے بڑھ کر دوسرا کون شوقین ہوگا۔ یہ سب رئیسوں ہی کے پسند کی چیزیں ہیں گنوار ان کی قدر کیا جانے؟

رما۔ ساڑھے آٹھ سو بہت ہوتے ہیں بھائی۔

چرنداس روپوں کا منہ نہ دیکھئے بابوجی! جب بہوجی پہن کر بیٹھیں گے تو ایک نگاہ میں سارے روپے وصول ہو جائیں گے۔

رما کو یقین تھا کہ جالپا زیوروں کی یہ قیمت سن کر آپ ہی بدک جائے گی — دلال سے اور زیادہ بات نہ کی۔ اندر جاکر زور سے ہنسا اور بولا۔ آپ نے اس کنگن کا کیا دام سمجھا تھا اماں؟

جالپا شری کوئی جواب دے کر بیوقوف نہ بننا چاہتی تھی۔ بولی۔ ان جڑاؤ چیزوں

میں ناپ تول کا تو کوئی حساب ہوتا نہیں، جتنے میں طے ہو جاوے وہی ٹھیک ہے۔

رما۔ اچھا تم بتاؤ جالپا۔ اس کنگن کا کتنا دام آ گئی ہو؟

جالپا۔ چھ سو سے کم نہیں ہے۔

رما نے قیمت کا خوف دکھا کر ان چیزوں کو واپس کر دینا چاہتا تھا، مگر اس میں اسے کامیابی نہ ہوئی۔ چھ اور سات میں تھوڑا ہی فرق تھا اور ممکن ہے چرندا س چھ سو ہی میں راضی ہو جائے۔ کچھ جھینپ کر بولا سچے نگینے نہیں ہیں۔

جالپا۔ کچھ بھی ہو۔ چھ سو سے زیادہ کا نہیں ہے۔

"اور رنگ کے؟"

"زیادہ سے زیادہ سو روپے۔"

"یہاں بھی چوکیں، ڈیڑھ سو مانگتا ہے۔"

"جٹو ہے کوئی۔ ہمیں ان دانوں لینا ہی نہیں۔"

رما کی چال الٹی پڑی۔ جالپا کو ان چیزوں کی قیمت کے بارے میں بہت غلط فہمی ہوئی تھی۔ لیکن سات سو ہی کوئی چھوٹی رقم ہے۔ آخر جالپا اس کی مالی حالت سے تو واقف تھی۔ پھر بھی سات سو روپے کی چیزوں کے لئے منہ کھولے بیٹھی تھی، رما کو کیا معلوم تھا کہ جالپا کچھ اور ہی سمجھ کر کنگن پر لہرائی تھی۔ اب تو گلا چھوٹنے کی ایک ہی تدبیر تھی اور وہ یہ کہ دلال چھ سو پر راضی نہ ہو۔ بولا، وہ ساڑھے آٹھ سو سے کوڑی کم نہ لیگا۔

جالپا۔ تو لوٹا دو۔ نہیں چلو، میں پوچھتی ہوں۔

رما کی روح فنا ہو گئی۔ دلال راضی ہو گیا تو پھر اس کے بنائے کچھ نہ بنے گی۔

جالپا دالان میں آ کر بولی۔ ذرا یہاں آنا جی۔ او ہراف! لوٹنے آئے ہو یا مال بیچنے آئے ہو، سات سو روپے کنگن کے مانگتے ہو۔

چرندا س، سات سو تو اس کی کاریگری کے دام ہیں، ہجور!

جالپا۔ اچھا جو اس پر سات سو نچھاور کرے۔ اس کے پاس لے جاؤ۔ یہاں تو دونوں چیزوں کے سات سو ملیں گے۔

چرنداس۔ بہوجی! آپ تو اندھیر کرتی ہو۔ کہاں ساڑھے آٹھ سو اور کہاں سات سو!

جالپا۔ تمہاری خوشی! اپنی چیز لے جاؤ۔

چرنداس نے خوشامد کرتے ہوئے کہا۔ اتنے بڑے دربار میں آکر چیز لوٹا لے جاؤں آپ یونہی ہنسیں۔ دس پانچ کی بات ہوتی تو آپ کی زبان پھیرتا۔ آپ سے جھوٹ نہیں کہتا۔ ان چیزوں پر پیسہ روپیہ نفع ہے۔ اسی ایک پیسے میں دکان کا بھاڑا۔ دستوری دلال سب سمجھئے۔ ایک بات ایسی سمجھ کر کہہ دیجئے کہ ہمیں بھی چار پیسے مل جائیں۔ سویرے سویرے لوٹنا نہ پڑے۔

جالپا نے بے اعتنائی سے کہا۔ کہہ دیئے وہی سات سو۔

چرنداس نے ایسا منہ بنایا گویا اس کی رقم ڈوبی جا رہی ہے۔ اور بولا۔ بہوجی ہے تو گھاٹا ہی مگر آپ کی بات نہیں ٹالتے بنتی۔ روپے کب ملیں گے۔

جالپا نے گھر میں جاتے ہوئے کہا۔ جلد ہی مل جائیں گے۔

جالپا اندر آکر بولی۔ آخر دیا کہ نہیں! ڈیڑھ سو صاف اڑائے لئے جاتا تھا مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ کچھ اور کم کیوں نہ کہا۔

یہ لوگ اسی طرح گاہکوں کو لوٹتے ہیں۔

رما کچھ نہ بولا۔ اس کی چالیں کچھ الٹی پڑیں کہ چار و ناچار اس کی گردن پر بوجھ لد ہی گیا۔

جالپا تو خوشی کی امنگ میں دونوں چیزیں لئے اوپر چلی گئی۔ مگر رما سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ جالپا نے اس کی حالت جان کر بھی ان چیزوں سے کیوں انکار

نہ کر دیا۔ کیوں زور دے کر نہیں کہا۔ میں نہ لونگی۔ انہیں واپس کر دو۔ اسے اس کا رنج تھا۔ آخر اس نے اپنے دل کو سمجھایا۔ یہ اپنی ہی حماقتوں کا کفارہ ہے۔ یہ میری ہی غلطی ہے۔ مجھے دلال کو دروازے ہی سے دھتکار دینا چاہیئے تھا۔

کھانا کھا کر جب رما اوپر کپڑے پہننے گیا تو جالپا آئینہ کے سامنے کھڑی کانوں میں رنگ پہن رہی تھی۔ اسے دیکھ کر بولی۔ آج کسی اچھے کا منہ دیکھ کر اٹھی تھی۔ دو چیزیں مفت ہاتھ آگئیں۔

رما نے تعجب سے پوچھا۔ مفت کیوں؟ روپے نہ دینے پڑیں گے۔

جالپا۔ روپے تو اماں جی دیں گی۔

رما۔ کیا کچھ کہتی تھیں۔

جالپا۔ انہوں نے میری نذر کئے ہیں تو روپے کون دے گا۔

رما نے اس کے بھولے پن پر مسکرا کر کہا۔ یہ سمجھ کر تم نے یہ چیزیں لے لیں۔ اماں کو دینا ہوتا تو اسی وقت دے دیتیں جب چوری ہوئی تھی۔

جالپا سہمی سہمی میں پڑ گئی۔ بولی تو مجھے کیا معلوم تھا۔ اب بھی لوٹا سکتے ہو، کہہ دینا جس کے لئے یہ چیزیں لی تھیں اسے پسند نہیں آئیں۔

یہ کہہ کر اس نے فوراً کانوں سے رنگ نکال لئے۔ کنگن بھی اتار ڈالے اور دونوں چیزیں کیسوں میں رکھ کر اس کی طرف اس طرح بڑھا دیں جیسے کوئی بلی چوہے سے کھیل رہی ہو۔ کیا بلی چوہے کو اپنی گرفت سے باہر ہونے دیتی ہے، وہ اسے چھوڑ کر بھی نہیں چھوڑتی۔ جالپا کا ہاتھ پھیلا ہوا تھا لیکن چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ کیوں وہ رما کی طرف نہ دیکھ کر زمین کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کسی مصیبت سے سبکدوش ہو جانے پر جو ہو جانے پر دلی مسرت ہونی چاہیئے۔ وہ کہاں تھی؟ اس کی حالت ٹھیک اسی کی سی تھی جو اپنے بیٹے کو پردیس جانے کی اجازت دے رہی ہو۔ وہی مجبوری

وہی کش مکش اس کے چہرے پر جھلک رہی تھی۔

رہا اتنا بے درد نہ تھا کہ وہ چیزیں اس کے ہاتھ سے لے لیتا۔ اسے تقاضے سہنا، شرمندہ ہونا، منہ چھپائے پھرنا، فکر کی آگ میں گھلنا سب کچھ منظور تھا مگر جالپا کو مایوس نہ کر سکتا تھا۔

اس نے مسکرا کر کہا۔ رہنے دو۔ اب لے لیا ہے تو کیا لوٹائیں؟ اماں بھی ہنسیں گی۔

جالپا نے مصنوعی تال اندیشی سے کہا۔ اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہیئے۔ ایک نئی مصیبت مول لینے کی کیا ضرورت ہے۔

رمانے گویا پانی میں ڈوبتے ہوئے کہا۔ ایشور مالک ہے فوراً نیچے چلا گیا۔

ہم عارضی شرم و لحاظ میں پڑھ کر اپنی زندگی کے سکون اور عافیت کا کیسے خون کر دیتے ہیں۔ اگر جالپا حسن کے اس جھونکے میں اپنے مستقبل کو رکھ سکتی۔ اگر رما جھوٹے لحاظ کے آگے سر نہ جھکا دیتا۔ دونوں کے دلوں میں سچی ہمدردی ہوتی۔ تو وہ گمراہ ہو کر تباہی کی طرف کیوں گامزن ہوتے۔

گیارہ بج گئے تھے۔ دفتر کے لئے دیر ہو رہی تھی۔ مگر رما اس طرح جا رہا تھا جیسے اپنے کسی عزیز کو دفن کر کے لوٹ رہا ہو۔

(۱۵)

جالپا اب وہ خلوت پسند نازنین نہ تھی جو دن بھر منہ لپیٹے اداس پڑی رہتی تھی۔ اسے اب گھر میں بیٹھنا اچھا نہ لگتا تھا۔ اب تک وہ مجبور تھی۔ کہیں آ جا نہ سکتی تھی۔ اب خدا کے فضل سے اس کے پاس بھی گہنے ہو گئے تھے۔ پھر وہ گوشۂ تنہائی میں کیوں پڑی رہتی۔ زیور لباس کوئی مٹھائی تو نہیں ہے، جس کی لذت تنہائی میں

حاصل کی جا سکے۔ محلے یا برادری میں کہیں سے بلاوا آتا تو وہ ساس کے ساتھ ضرور جاتی۔ کچھ دنوں کے بعد ساس کی ضرورت بھی نہ رہی۔ وہ اکیلی ہی آنے جانے لگی۔ اس کی شکل وصورت، زیور، لباس اور آداب و اخلاق نے تھوڑے ہی دنوں میں اسے محلے کی عورتوں میں اعزاز کے رتبہ پر پہنچا دیا۔ اس کے بغیر محفل سونی رہتی۔ اس کے گلے میں اتنا لوچ تھا۔ انداز گفتگو اتنا دل آویز اور آدائیں اتنی دلکش کہ وہ محفل کی رانی معلوم ہوتی تھی۔ روز ہی کہیں نہ کہیں عورتوں کا جماؤ ہو جاتا۔ گھنٹے دو گھنٹے گا بجا کر یا گپ شپ کر کے عورتیں دل بہلا لیا کرتیں۔ پھاگن میں پندرہ دن لگاتار برابر گانا ہوتا رہا۔ کبھی کسی کے گھر، کبھی کسی کے گھر۔ جالپا نے جیسا حسن پایا تھا ویسا ہی فیاض دل بھی پایا تھا۔ مہمان نوازیوں کا خرچ بیشتر اس کے ذمہ آتا۔ کبھی کبھی گانے والیاں بلائی جاتیں۔ ان کی خاطر مدارات کا بار بھی اسی پر تھا۔ کبھی کبھی مستورات کے ساتھ ندی اشنان کرنے جاتی۔ تانگے کا کرایہ اور ناشتہ کا خرچ اسی کے ذمے جاتا۔ اسی طرح سے دو تین روپیہ روز اڑ جاتے تھے۔ رما جانثار شوہر تھا۔ جالپا کے قدموں پر اپنی جان تک صدقے کر دیتا۔ روپیہ کی حقیقت کیا تھی اس کا منہ تاکتا رہتا تھا۔

ایک بار مستورات کو سنیما دیکھنے کی دھن سوار ہوئی۔ اس میں انہیں مزا آیا کہ آئے دن سنیما کی سیر ہونے لگی۔ رما کو اب تک سنیما کا شوق نہ تھا۔ شوق ہوتا بھی تو کیا کرتا اب ہاتھ میں پیسے آنے لگے۔ اس پر جالپا کا اصرار پھر بھلا وہ کیوں نہ جاتا۔ سنیما حال میں ایسی کتنی ہی عورتیں نظر آتیں جو منہ کھولے بے حجاب بیٹھتی بولتی رہتی تھیں۔ ان کی آزادی نادانستہ طور پر جالپا پر بھی جادو ڈالتی جاتی تھی۔ وہ گھر سے باہر نکلتے ہی منہ کھول لیتی مگر حجاب کے باعث پردہ نشینوں کے ساتھ ہی بیٹھتی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ رما بھی اس کے ساتھ بیٹھے۔ آخر وہ ان فیشن ایبل عورتوں سے کس بات میں کم ہے، روپ رنگ میں کم نہیں۔ بیچ دھیچ میں کم نہیں؟ پھر وہ پردے والیوں کے ساتھ کیوں بیٹھے۔ رما

بہت تعلیم یافتہ ہونے پر بھی دورِ جدید کے اثر سے آزاد خیال تھا۔ پہلے تو وہ پردے کا ایسا حمایتی تھا کہ ماں کو کبھی گنگا اشنان کرنے لے جاتا۔ تو پنڈوں تک سے نہ بولنے دیتا۔ کبھی ماں کی ہنسی مردانے میں سنائی دیتی تو آگ بگولا ہو جاتا۔ تم کو ذرا بھی شرم نہیں اماں۔ باہر لوگ بیٹھے ہوئے ہیں اور تم ہنس رہی ہو۔ ماں شرما جاتی تھی مگر عمر کے ساتھ رما کا وہ حجاب غائب ہو جاتا تھا۔ اس پر جالپا کا شگفتہ حسن اسے اور بھی دلیر بنا رہا تھا۔ جالپا بدوضع بدشکل یا بدتمیز ہوتی تو اسے وہ زبردستی پردے میں بٹھاتا۔ اس کے ساتھ سیر کرنے میں اسے شرم آتی۔ جالپا جیسی ہمشکل حسینہ کے ساتھ سیر کرنے میں لطف کے ساتھ ہی کچھ وقار بھی تھا۔ وہاں کے مہذب طبقے میں کوئی نازنین اتنی قبول صورت اتنی خوش ادا اتنی خوش قامت نہ تھی۔ دیہات کی لڑکی ہونے پر بھی وہ شہریت کے رنگ میں ایسی رنگ گئی تھی۔ گویا شہر میں ہی اس کی پرورش ہوئی ہے۔ تھوڑی سی انگریزی تعلیم کی تھی۔ وہ رما پوری کئے دیتا تھا۔

مگر پردے کی یہ بندش ٹوٹے کیسے؟ سنیما ہال میں رما کے کتنے ہی دوست کتنے ہی شناسا بیٹھے نظر آتے تھے۔ وہ اسے جالپا کے ساتھ بیٹھے دیکھ کر کتنا مضحکہ اڑائیں گے۔ کتنے فقرے کسیں گے۔

آخر ایک دن اس نے سب کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑے ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ جالپا سے بولا۔ آج ہم تم سنیما گھر میں ساتھ بیٹھیں گے۔

جالپا کے دل میں گدگدی ہونے لگی۔ بولی۔ سچ؟ نہیں بھائی ساتھ والیاں زندہ نہ چھوڑیں گی۔

رما۔ اس طرح ڈرنے سے تو کچھ نہ ہوگا۔ یہ کیا مذاق ہے کہ عورتیں منہ چھپائے چق کی آڑ میں بیٹھی رہیں۔ اس طرح یہ معاملہ بھی طے ہو گیا۔ دو چار دن دونوں کچھ جھینپتے رہے لیکن پھر ہمت کھل گئی۔ یہاں تک کہ رما اور جالپا شام کے وقت پارک میں ساتھ ساتھ

ٹہلتے نظر آنے لگے۔

ایک دن جالپا نے مسکرا کر کہا۔ کہیں بابو جی دیکھ لیں تو ؟

" تو کیا ؟ کچھ نہیں۔"

" میں تو مارے شرم کے گڑ جاؤں !"

" ابھی تو مجھے بھی شرم آئے گی۔ مگر وہ خود ادھر نہ آئیں گے۔"

" اور کہیں اماں دیکھ لیں تو ؟"

" اماں سے کون ڈرتا ہے۔ دو دلیلوں میں ٹھیک کر دونگا۔"

دس پانچ دن سے اس نئی سوسائٹی میں اپنا رنگ جما لیا۔ اس نے اس دائرے میں کچھ اس طرح قدم رکھا جیسے کوئی باکمال مقرر پہلی بار منبر پر آتا ہے اور نقادان نامہدرد ہونے پر بھی اس کے کمال کے آگے سر جھکا دیتے ہیں۔ جالپا کے حسن میں وہ تمکنت، وہ خودداری تھی جو عالی نسبی کی دلیل ہے۔ پہلے ہی دن ایک خاتون نے جالپا کو چائے کی دعوت دی اور جالپا نے خواہش نہ ہونے پر بھی اسے قبول کر لیا۔

جب دونوں آدمی وہاں سے لوٹے تو رما نے متفکرانہ انداز سے کہا۔ تو کل اس کی چائے پارٹی میں جانا پڑے گا۔

" تو کیا کرتی ! انکار کرتے بھی تو نہ بنتا تھا۔"

تو سویرے تمہارے لئے ایک اچھی سی ساڑھی لا دوں ؟

" میرے پاس تو ساڑھیاں ہیں۔ ذرا دیر کے لئے پچاس ساٹھ روپے خرچ کرنے سے کیا فائدہ ؟"

" تمہارے پاس اچھی ساڑھی کہاں ہے ؟ جیسی اس کی ساڑھی تھی ویسی ہی میں بھی لاؤں گا۔"

" مجھے صاف کہہ دینا چاہیئے تھا کہ میں نہیں آسکتی۔"

"پھر اس کی دعوت بھی تو کرنی پڑے گی؟"

"یہ تو بڑی مصیبت گلے پڑی۔"

"مصیبت تو کچھ نہیں ہے۔ صرف یہی خیال ہے کہ میرا مکان بے مصرف ہے۔ میز کرسیاں، چائے کے سیٹ تو رمیش کے یہاں سے مانگ لاؤں گا۔ لیکن گھر کے لئے کیا کروں؟"

"کیا یہ ضروری ہے کہ ہم بھی اس کی دعوت کریں؟"

رما نے اس جملے پر کچھ التفات نہ کیا۔ اسے جالپا کے لئے ایک خوبصورت کلائی کی گھڑی اور ایک ساڑھی کی فکر پیدا ہو گئی۔ اس کے پاس ایک کوڑی بھی نہ تھی اس کا خرچ روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ ابھی تک صرافوں کو ایک پیسہ دینے کی نوبت بھی نہ آئی تھی۔ ایک بار گنگو نے اشارے سے تقاضا بھی کیا تھا لیکن یہ بھی تو نہیں ہو سکتا کہ جالپا پھٹے حالوں چائے پارٹی میں جائے۔ رات بھر تو اس نے صبر کیا۔ دوسرے دن دونوں چیزیں لا کر ہی دم لیا۔

جالپا نے جھنجلا کر کہا۔ میں نے تمہیں منع کیا تھا۔ ڈیڑھ سو سے کم کی نہ ہونگی۔

ڈیڑھ سو! اتنا فضول خرچ میں نہیں ہوں۔"

"ڈیڑھ سو سے کم کی یہ چیزیں نہیں ہیں۔"

رما نے جالپا کی کلائی پر گھڑی باندھ دی اور فرطِ فرحت ہو کر بولا۔ تمہاری کلائی یہ کیسی کھل رہی ہے؟ میرے روپے وصول ہو گئے۔

سچ بتاؤ۔ کتنے خرچ ہوئے۔"

"سچ بتا دوں۔ ایک سو پینتیس روپے۔ پچھتر روپے کی ساڑھی، دس کے جوتے، اور پچاس کی گھڑی۔"

جالپا ملول ہو کر بولی۔ وہ ڈیڑھ سو ہی ہوئے۔ مگر یہ سب روپے ادا کیسے

ہونگے۔اس چڑیل نے ناحق مجھے دعوت دی۔اب میں باہر جانا ہی چھوڑ دوں گی۔

رما بھی اسی فکر میں غرق تھا۔پر اس کا اظہار کرکے جالپا کی مسرت میں کیسے رخنہ ڈالتا بولا۔سب ادا ہو جائے گا۔

" جالپا نے ترش ہو کر کہا۔کہاں سے ادا ہو جائے گا۔ذرا سنوں ؟ کوڑی تو بچتی نہیں ادا کہاں سے ہو جائیگا۔ان چیزوں کو لوٹا آؤ۔"

رما نے منت آمیز لہجہ میں کہا۔ان چیزوں کو رکھ لو۔پھر تم سے بغیر پوچھے نہ لاؤنگا

شام کو جالپا نے نئی ساڑھی پہنی۔گھڑی کلائی پر باندھی اور آئینہ میں اپنی صورت دیکھی تو غرور اور مسرت سے اس کا چہرہ روشن ہو گیا۔اس نے ان چیزوں کو واپس کرنے کے لئے خواہ سچے دل سے اصرار کیا ہو۔پر اس وقت وہ اتنی نفس کشی کے لئے تیار نہ تھی۔شام کو جالپا اور رما چھاؤنی کی طرف چلے۔اس خاتون کا بنگلہ ملنے پر دیر نہ ہوئی۔پھاٹک پر سائن بورڈ تھا۔"اندر بھوشن ایڈوکیٹ" اب معلوم ہوا۔وہ ان وکیل صاحب کی بیوی تھی۔پنڈت جی یہاں کے نامی وکیل تھے۔رما نے انہیں کئی بار دیکھا تھا لیکن اتنے بڑے آدمی سے اس کے ذاتی مراسم کیا ہوتے۔چھ مہینے پہلے وہ اس کا خیال بھی نہ کر سکتا تھا کہ کبھی وہ ان کے یہاں مدعو ہوگا۔مگر جالپا کی بدولت وہ اعزاز بھی اسے حاصل ہو گیا۔ اس وقت وہ شہر کے سب سے بڑے وکیل کا مہمان تھا۔

رما نے سوچا تھا۔یہاں بہت سے آدمیوں کی دعوت ہوگی۔مگر یہاں وکیل صاحب اور ان کی بیوی کے سوا اور کوئی نہ تھا۔انہیں دیکھتے ہی باہر نکل آئی اور انہیں اندر لے جا کر اپنے شوہر سے ان کا تعارف کرایا۔پنڈت جی نے آرام کرسی پر لیٹے لیٹے دونوں مہمانوں سے ہاتھ ملایا اور رما سے بولے۔معاف کیجئے گا بابو صاحب میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔یہاں آپ کسی دفتر میں ہیں ؟

رما نے جھینپتے ہوئے کہا۔جی ہاں میونسپل آفس میں ہوں۔ابھی حال ہی میں

آیا ہوں۔ قانون کی طرف جانے کا ارادہ تھا۔ لیکن یہاں نئے وکیلوں کی حالت دیکھ کر ہمت نہ پڑی۔

رما نے اپنا وقار بڑھانے کے لئے تھوڑا سا جھوٹ بولنا ضروری سمجھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا اثر خاطر خواہ ہوا۔ اگر وہ صاف کہہ دیتا۔ میں پچیس روپے کا کلرک ہوں تو شاید وکیل صاحب اس سے ہم کلام ہونے میں اپنی توہین سمجھتے۔ مسکرا کر بولے۔ آپ نے بہت اچھا کیا جو ادھر نہیں آئے۔ دو چار سال کے بعد آپ کسی اچھے عہدے پر پہنچ جائیں گے۔ یہاں ممکن ہے تب تک آپ کو کوئی مقدمہ ہی نہ ملتا۔

جالپا کو ابھی تک شبہ ہو رہا تھا کہ رتن وکیل صاحب کی لڑکی ہے یا بیوی؟ وکیل صاحب کی عمر ساٹھ سے متجاوز تھی۔ چکنی چاند آس پاس کے سفید بالوں کے بیچ میں وارنش کی ہوئی لکڑی کی طرح چمک رہی تھی۔ مونچھیں صاف تھیں۔ لیکن ماتھے کے شکن اور گالوں کی جھریاں بتا رہی تھیں، مسافر منزل کے قریب پہنچ گیا ہے۔ مریض آرام کرسی پر لیٹے ہوئے وہ ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے برسوں کا مریض ہو۔ ہاں رنگ گورا تھا جو ساٹھ سال کی گرمی اور سردی کھا کر بھی اڑ چکا تھا۔ اونچی ناک تھی۔ اونچی پیشانی اور بڑی بڑی آنکھیں جن میں غرور لبریز تھا۔ اس کے برعکس۔ رتن سانولی بیچ اور بھرے ہوئے بدن کی عورت تھی۔ نہایت ملنسار اور خنداں پیشانی جسے غرور چھو تک نہ گیا تھا۔ اس کی شکل میں حسن کی کوئی علامت نہ تھی۔ ناک چپٹی تھی۔ چہرہ گول۔ آنکھیں چھوٹی پھر بھی وہ رانی سی لگتی تھی۔ جالپا اس کے سامنے ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے سورج مکھی کے سامنے جوہی کا پھول!

چائے آئی۔ میوے۔ پھل۔ مٹھائی۔ برف کی قلفی سب میزوں پر چن دی گئی رتن اور جالپا ایک میز پر بیٹھیں۔ دوسری میز رما اور وکیل صاحب کی تھی۔ رما اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ مگر وکیل صاحب ابھی آرام کرسی پر لیٹے ہوئے تھے۔

رما نے مسکرا کر وکیل صاحب سے کہا۔ آپ بھی تو آیئے۔

وکیل صاحب نے لیٹے ہی لیٹے جواب دیا۔ آپ شروع کیجئے میں بھی آجاتا ہوں۔

لوگوں نے چائے پی، پھل کھائے، مگر وکیل صاحب کے سامنے ہنستے بولتے رما اور جالپا دونوں ہی جھجکتے تھے۔ زندہ دل بوڑھوں کے ساتھ تو صحت کا لطف اٹھایا جاسکتا تھا لیکن ایسے روکھے سر کہ جنہیں بے جان آدمی جوان بھی ہوں تو دوسرے کو افسردہ دل بنا دیتے ہیں۔ وکیل صاحب نے بہت اصرار کرنے پر دو گھونٹ چائے پی۔ دور سے بیٹھے تماشہ دیکھتے رہے۔ اس لئے جب رتن نے جالپا سے کہا۔ چلو ہم لوگ ذرا باغیچہ کی سیر کر آویں۔ ان دونوں صاحبوں کو قانون اور اخلاق کی بحث کرنے دیں تو گویا جالپا کے گلے کا پھندا کھل گیا۔ رما نے پنجرے میں بند طائروں کی طرح ان دونوں کو کمرے سے نکلتے دیکھا اور ایک لمبی سانس لی۔ وہ جانتا کہ یہ مصیبت اس کے سر آئے گی تو یہاں آنے کا نام نہ لیتا۔

وکیل صاحب نے منہ سکوڑ کر پہلو بدلا۔ اور بولے۔ معلوم نہیں کہ پیٹ میں کیا ہو گیا ہے کہ کوئی چیز ہضم ہی نہیں ہوتی۔ دودھ بھی ہضم نہیں ہوتا۔ چائے کو نہ جانے لوگ اتنے شوق سے پیتے ہیں۔ مجھے تو اس کی صورت سے نفرت ہے۔ پیتے ہی جسم میں اینٹھن سی ہونے لگتی ہے اور آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگتی ہیں۔

رما نے پوچھا۔ آپ نے ہاضمہ کی دوا نہیں کی۔

وکیل صاحب نے بے خانہ انداز سے کہا۔ دوائیوں پر مجھے ذرا بھی اعتبار نہیں ان ویدوں اور ڈاکٹروں سے زیادہ کج فہم آدمی دنیا میں نہ ملیں گے۔ کسی میں بھی تشخیص کا مادہ نہیں۔ کبھی دو ویدوں یا ڈاکٹروں کی تشخیص ایک ساں نہ ہوگی۔ علامتیں وہی ہیں مگر ایک ویدجی کا فساد بتلاتا ہے دوسرا صفرا کا۔ ایک ڈاکٹر پھیپھڑے کا آماس بتلاتا ہے تو دوسرا معدے کا سرطان۔ بس قیاس سے دوا کی جاتی ہے اور بے رحمی سے

مریضوں کی گردن پر چھری پھیری جاتی ہے۔ ان ڈاکٹروں نے تو اب تک مجھے جہنم میں پہنچا دیا ہوتا۔ پر کسی طرح ان کے پنجے سے نکل بھاگا۔ یوگ کے علم کی بڑی تعریف سنتا ہوں لیکن ایسا مہاتما نہیں ملتا جس سے کچھ سیکھ سکوں۔

یہاں تو فن طب پر اعتراضات ہو رہے ہیں۔ اور ادھر دونوں حسینوں میں راز و نیاز کی باتیں ہو رہی تھیں۔ رتن نے مسکرا کر کہا۔ وکیل صاحب کو دیکھ کر تمہیں بڑا تعجب ہوا ہوگا۔ میں ان کی دوسری بیوی ہوں۔ پہلی بیوی کو مرے پینتیس سال ہو گئے اس وقت ان کی عمر کل پچیس سال کی تھی۔ لوگوں نے سمجھایا۔ دوسری شادی کر لو۔ لیکن ایک لڑکا موجود تھا۔ شادی کرنے سے انکار کر دیا اور تیس سال تک تنہا رہے۔ مگر آج پانچ سال ہوئے جوان بیٹے کا انتقال ہو گیا۔ تب دوسری شادی کی فکر ہوئی۔ میرے ماں باپ نہ تھے۔ ماموں نے میری پرورش کی تھی۔ کہہ نہیں سکتی کہ ان سے کچھ لے لیا۔ یا ان کی شرافت پر ریجھ گئے۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ ایشور کی یہی مرضی تھی۔ مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ بس اگر کوئی شکایت ہے تو یہی کہ میں روز بروز موٹی ہوتی چلی جاتی ہوں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ تمہیں اولاد نہیں ہو سکتی۔ بہن مجھے تو اولاد کی آرزو نہیں۔ لیکن وکیل صاحب نے اولاد کے لئے شادی ہی کی تھی۔ میری یہ حالت دیکھ کر انہیں بہت رنج ہوتا ہے۔ میں ہی ان کی ساری شکاریوں کی جڑ ہوں۔ آج ایشور مجھے ایک لڑکا دیدے ان کے سارے روگ دور ہو جائیں۔ کتنا چاہتی ہوں کہ دُبلی ہو جاؤں۔ گرم پانی سے ٹب اشنان کرتی ہوں۔ روز پیدل گھومنے جاتی ہوں گھی دودھ بہت کم کھاتی ہوں۔ خوراک بھی آدھی کر دی ہے جتنی محنت کر سکتی ہوں اتنی کرتی ہوں۔ پھر بھی دن بدن موٹی ہوتی جاتی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔

جالپا نے پوچھا۔ وکیل صاحب تم سے ناراض رہتے ہوں گے۔

رتن نے کہا۔ نہیں بہن بالکل نہیں۔ کبھی بھول کر بھی مجھ سے اس کا چرچا نہیں

کیا۔ شکایت کا کبھی ایک حرف بھی میں نے ان کی زبان سے نہیں سُنا۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ یہ فکر انہیں گھلائے ڈالتی ہے۔ اپنا کوئی قابو نہیں ہے کیا کروں؟ میں جتنا چاہوں خرچ کروں۔ جیسے چاہوں رہوں۔ کبھی نہیں بولتے۔ جو کچھ پاتے ہیں لاکر میرے ہاتھ پر رکھ دیتے ہیں۔ سمجھاتی ہوں اب تمہیں وکالت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آرام کیوں نہیں کرتے۔ مگر ان سے بیٹھا بھی نہیں جاتا۔ صرف دو چار پیشوں سے ناتا ہے۔ میں نے بہت ضد کی تو دو چار دانے انگور کے کھا لئے۔ مجھے تو ان پر رحم آتا ہے جو خدمت اپنے امکان میں ہے وہ کرتی ہوں۔ آخر وہ میرے ہی لئے تو اپنی جان کھپا رہے ہیں۔

جالپا نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ایسے نیک نفس آدمی کو دیوتا سمجھنا چاہیئے تیس سال تک تنہا رہنا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔

رتن۔ ہاں بہن! ہیں تو دیوتا ہی۔ اب بھی کبھی پہلی بیوی کی یاد آجاتی ہے تو رونے لگتے ہیں۔ دیکھنے میں جتنے روکھے معلوم ہوتے ہیں۔ اندر سے اتنے ہی نرم ہیں یتیموں اور بیواؤں کے وظیفے باندھ رکھے ہیں۔ تمہارا یہ کنگن تو بڑا خوشنما ہے۔

جالپا۔ ہاں! ہوشیار کاریگر نے بنایا ہے۔

رتن۔ میں تو یہاں کسی کو جانتی نہیں۔ وکیل صاحب کو تکلیف دینے کو جی نہیں چاہتا۔ معمولی سناروں سے بنواتے ڈر لگتا ہے نہ جانے کیا ملا دیں۔ تم اپنے بابوجی سے میرے لئے ایسا ہی ایک جوڑ کنگن بنوا دو۔

جالپا نے کنگن بنوانے کا وعدہ کیا۔

رتن۔ آج تمہارے آنے سے طبیعت بہت خوش ہوئی۔ دن بھر اکیلی پڑی رہتی ہوں۔ کس کے پاس جاؤں؟ دو ایک عورتوں سے راہ رسم بڑھائی۔ چاہا کہ ان سے بہناپا جوڑوں۔ لیکن ان کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر ان سے دور

رہنا ہی اچھا معلوم ہوا۔ شوق کی چیزوں پر ایسا ٹوٹتی تھی کہ دیکھ کر شرم آتی تھی تم گھنٹے آدھ گھنٹے کے لئے روز چلی آیا کرو۔

جالپا سواہ! یہ تو میرے دل کی بات ہوئی۔

رتن۔ میں موٹر بھیجدیا کرونگی۔

"کیا ضرورت ہے؟ تانگے تو ملتے ہی ہیں۔"

"نہ جانے کیوں تمہیں چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ تمہیں پاکر رمانا تھ اپنی تقدیر کو سراہتے ہوں گے۔"

جالپا مسکرا کر بولی۔ "تقدیر تو نہیں سراہتے۔ گھر کیاں جما یا کرتے ہیں۔"

اسی اثنا میں رمانا تھ بھی وہاں آپہنچا۔ جالپا نے اس سے کنگن کا ذکر کیا

رمانے سرخرو ہونے کا موقع پاکر کہا۔ ہاں بنوا دونگا۔ اس سے بہت اچھے بنا سکتا ہے۔

رتن نے پوچھا۔ اس جوڑے کے کیا لئے تھے۔

جالپا آٹھ سو کے تھے۔

رتن "کوئی ہرج نہیں۔ مگر بالکل ایسے ہی ہوں۔ اسی نمونے کے۔"

رما۔ ہاں! بنوا دوں گا۔

رتن۔ مگر بھائی ابھی میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔

روپے کے معاملے میں عورتوں کے سامنے مردوں کی زبان بند ہو جاتی ہے۔ کیا وہ کہہ سکتا تھا۔ اس وقت میرے پاس بھی روپے نہیں ہیں۔ یہ عذر وہ کسی حالت میں بھی نہیں کر سکتا تھا۔ چاہے اسے دوسروں سے قرض لینا پڑے۔ دوسروں کی خوشامد کرنی پڑے مگر ایک حسینہ کے روبرو اپنی مجبوری کا اظہار نہ کرے گا۔ شاید اس لئے جب رمانے دلیرانہ انداز سے کہا کہ روپے کی کوئی بات نہیں۔ جب چاہے دے دیجئے تو وہ خوش

ہوگئی۔

رتن۔ تو کب تک اُمید کروں۔

رما۔ میں آج ہی صراف سے کہہ دوں گا۔ زیادہ سے زیادہ دو ہفتہ سمجھئے۔

جالپا نے رتن کو اپنے گھر جانے کی دعوت دی۔ اور دونوں گلے مل کر بدا ہوئیں۔ گھر پہنچے تو شام ہو گئی تھی۔ رمیش بابو بیٹھے ہوئے تھے۔ جالپا تو اتر کر اندر چلی گئی۔ رما رمیش کے پاس جا کر بولا۔ آپ کو آنے میں دیر ہوئی۔

رمیش۔ ابھی تو چلا آ رہا ہوں۔ وکیل صاحب کے یہاں دعوت تھی؟

رما۔ جی ہاں! تین روپے کی چپت پڑ گئی۔

رمیش۔ کوئی ہرج نہیں۔ یہ روپے وصول ہو جائیں گے۔ بڑے آدمیوں سے راہ و رسم پیدا ہو جائے تو بڑے بڑے کام نکلتے ہیں۔

رما۔ اب کی اتوار کو انہیں بھی چائے کی دعوت دے آیا ہوں۔

رمیش نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ تب تو یہ کہو۔ کہ تم سے یارانہ ہو گیا۔ کہو تو میں بھی آجاؤں۔ سنا ہے وکیل صاحب کے ایک بھائی انجینئر ہیں۔ میرے ایک سالے بہت دنوں سے بیکار بیٹھے ہوئے ہیں اگر وکیل صاحب اس کی سفارش کر دیں تو غریب کو جگہ مل جائے۔ تم ذرا انٹروڈکشن کر دینا۔ باقی میں اور سب کر لونگا۔ پارٹی کا انتظام ایشور نے چاہا تو ایسا ہوگا کہ وہ لوگ خوش ہو جائیں گے۔ سارا انتظام میرے اوپر چھوڑ دو۔ نہ قلی کی ضرورت نہ مزدور کی۔ انہیں موسل چند کو پھانسونگا۔

رما۔ ابھی دو تین مہینے ہوئے آپ نے انہیں ایک جگہ تو دلا دی تھی۔

رمیش۔ اجی ابھی اور چھ باقی ہیں۔ پورے سات آدمیوں کی پلٹن ہے۔ ذرا بیٹھ جاؤ ضروری چیزوں کی فہرست بنالی جائے کتنے مہمان ہوں گے۔

رما۔ بس وکیل صاحب ہونگے اور ان کی بیوی۔